اسلامی معاشرہ کے تنزّل کا اہم سبب

(ازمنۂ وسطیٰ میں عروج و زوال کی داستان کا ایک ورق)

از: ڈاکٹر سیّد مقبول احمد صاحب

ترجمہ: جناب عابد رضا صاحب بیدار

تاریخِ عرب کے مختلف ادوار میں عباسی عہد (۷۵۰ء — ۱۲۵۸ء) عام طور سے اہم دور سمجھا گیا ہے کیونکہ اس عہد میں سلطنتِ عباسیہ کے حدود میں رہنے والے باشندوں نے قابلِ لحاظ سماجی اور تہذیبی ترقی کی۔ اس دور کی اہمیت کا اندازہ تاریخِ عالم میں اس کے طویل زمانے سے (جو پانچ سو برس سے کچھ زیادہ ہی ہے) اور دور دراز تک ایشیا اور افریقا میں پھیلی ہوئی اس کی حکومت سے نہیں لگانا چاہیئے۔ نہ زندگی کے متعدد شعبوں میں عباسی عوام کے رنگا رنگ اور متنوع فتوحات سے اس کی اہمیت ناپنا چاہیئے۔ اس عہد کی تاریخی اہمیت اصل میں یہ ہے کہ پہلی عباسی صدی میں قدیم یونانیوں کے علم و دانش کا بڑا حصہ، اور اس کے ساتھ ساتھ قدیم ہندستان اور قدیم ایران کے علوم عربوں کو منتقل ہو گئے، جنھوں نے اُسے اس طرح اپنا لیا کہ بالآخر وہ ان کے اپنے بیش بہا ورثہ کا جزو بن گئے۔ اس عربی ورثہ نے عربی ادب کے ذریعہ یا پھر صلیبی جنگوں کے واسطے سے عربی افکار نے یورپ میں نفوذ کے ذریعہ یورپ کے ازمنۂ وسطیٰ میں عیسائیت کو کس کس طور پر، کتنے گہرے انداز سے، اور کہاں کہاں متاثر کیا —— یہ وہ سوال ہیں جن پر تفصیل سے کام کیا جاتا ہے۔ ایک بات البتہ یقینی ہے کہ علوم و فنون کا یہ سارا ذخیرہ، سارے تجربات اور اس عہد کے مسلمانوں، عیسائیوں، یہودیوں اور بہت سے دوسروں کی وہ ساری ذہانت جو عربی اسلامی ادب میں محفوظ رہ گئی، اس سب نے ملکر عباسی عہد کے بعد ایشیا اور افریقا کے بہت

ممالک پر غیر مسلسل مگر طویل ادوار، خاص کر سلطنتِ عثمانیہ، وسطِ ایشیا، ہندوستان، ایران اور مصر۔ تاہم ان سب میں عباسی عہد کی وہ امتیازی خصوصیت نمایاں طور پر مفقود ہے جسے ذہنی ارتقا کی اور حرکی اصطلاح کہا جاسکتا ہے۔

آٹھویں صدی سے گیارھویں صدی تک، آرٹ کا میدان ہو، سائنس اور ادب ہو، یا علم و فن، ڈپلومیسی اور قانون ہو، لوگ ترقی کی شاہراہ پر گامزن تھے اور تجربہ و آزمائش کے ذریعہ ہر لمحہ کچھ نہ کچھ سیکھتے جاتے تھے۔ نئے نئے میدان تلاش کرکے کامیابی کے نئے امتیاز حاصل کرتے جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ ایک نئے جوش و جذبہ سے سرشار ہیں، جستجو اور تلاش کا جذبہ، جو ان کی ساری علمی اور تعلیمی سرگرمیوں میں جاری و ساری تھا۔ ایسا کبھی کبھی تو یہ لوگ قدیم، ماہرینِ علوم و فنون کے افکار و نظریات پر بھی نئے تجربات اور ان سے متعلق نتائج کی روشنی میں، اپنے شکوک کا اظہار کردیا کرتے تھے، شاید سائنسی تجربہ کو لوگوں کی عملی ضروریات کے پورا کرنے کے لئے استعمال کیا جانے لگا تھا۔ مجموعی طور سے علم کو دستکاریوں اور صنعتوں میں، جہازسازی اور جہازرانی میں، اور زندگی کے بہت سے میدانوں میں تعلیم، حفظانِ صحت، سیاسیات، اور خود مذہب کے معاملات و مسائل میں کام میں لایا جاتا تھا۔ تعلیم عوام میں مقبول ہوتی جارہی تھی اور سیاحت و مہم آزمائی کے ذریعہ جغرافیائی علم کی ترقی اور اقالیمِ عالم کے بڑے حصہ کے بارے میں تجربہ سے، زندگی کے بارے میں ان لوگوں کے نقطۂ نگاہ میں زیادہ وسعت آگئی تھی۔ نتیجۃً تاجروں، سوداگروں، ملاحوں، جہازرانوں (ارباب)، مبلغوں اور سیاح جہاں گردوں مؤرخوں کے علاوہ عام لوگوں میں سے اکثر کے اندر بھی اس لٹریچر کے اوراق پلٹنے کی بیتاب خواہش مچلتی رہتی تھی جسے "عجائب" لٹریچر کہہ لیجئے، وہ جو اس عہد میں کثرت سے تصنیف کیا جاتا تھا، اور جس میں ان دور دراز جگہوں اور نامعلوم سرزمینوں کی عجیب و غریب اور دلچسپ داستانیں ہوتی تھیں جہاں عرب جہازراں اور سیاح سوداگر ہو آئے تھے۔ جہازرانوں کے ولولہ اور عزم سے بھرپور گیت، جو اس زمانے کے پرصعوبت سفروں کے لئے ہمت بندھاتے تھے، مورخوں نے محفوظ کرلئے ہیں۔ مہم آزمائی کی اسپرٹ کی کوئی کمی نہ تھی، اور بحیرۂ ظلمات کا پہلا عرب سیاح (دریافت کنندہ) اسپین کا خشخاش تھا۔ امکان ہے کہ زمین کے مختصر ہونے کے بارے میں [illegible] کے اس نظریہ نے ابن [illegible] کو سفر پر مائل کیا ہو جو اس [illegible] میں مسلمہ حیثیت

رکھتا تھا اور کولمبس کے عہد تک مانا جاتا رہا۔ اگرچہ عربوں کو اس بات کا دھندلا سا احساس تھا کہ بحیرۂ ہند کہیں نہ کہیں پر پانی ہی کے ذریعہ بحیرۂ اطلانطک اور بحیرۂ روم سے ملا ہوا ضرور ہے، اور نویں صدی میں اس کا ثبوت بھی مل گیا تھا۔ تاہم عرب یہ تصور نہیں کر سکتے تھے کہ بحیرۂ اطلانطک اور بحیرۂ ہند جنوبی افریقا کے اطراف میں کسی جگہ ملے ہوئے ہیں؛ کیونکہ بطلیموس کے نظریہ کے مطابق پورا جنوبی کرہ خشکی سے گھرا ہوا تھا، اور یہ کہ یہ خشکی یا زمین افریقا کے مشرقی ساحل سے چین تک پھیلی ہوئی تھی! یہ صرف البیرونی کی ذہانت تھی جو اتنی ہمارے نظریہ سازی کر سکتا تھا کہ جنوبی افریقا کے سواحل پر کچھ ایسی خلیجوں اور کھاڑیوں کی موجودگی کے امکانات ہیں جو بحیرۂ ہند کو بحیرۂ اطلانطک سے ملاتی ہیں۔

عرب، افریقا کا جنوبی ساحل اور راس امید کے اطراف دریافت کرنے میں کیوں ناکام رہے، یہ بات اس طرح پر سمجھ میں آتی ہے کہ یوں تو یہ لوگ جنوب میں دور دراز مشرقی افریقا کے ساحل پر آباد سوفالا تک تجارت کے سلسلہ میں آتے جاتے تھے لیکن ان کی چھوٹی چھوٹی کشتیاں اتنی مضبوط نہ تھیں کہ وہ تیز سمندری طیاروں (دھاروں) اور طوفانوں کو پار کر سکتیں، اور ان سے آگے بڑھ کے جنوب میں ہر ایک کو واسطہ پڑتا، کچھ یہ بات بھی ہوگی کہ غیر متمدن وحشی افریقی قبائل نے بھی ان لوگوں کو نیل کے ماخذ تک پہنچنے سے باز رکھا ہوگا اور مشرقی افریقا کے سردوں کے سفاری، بھی عرب ملاحوں کو آسٹریلیا کے سواحل تک پہنچنے دینے میں حائل رہے ہوں گے، بہرطور بحیرۂ ہند تو عرب ملاحوں کی جاگیر ہی بن گیا تھا اور اس صورتِ حال میں ابن ماجد کے وقت تک کوئی تبدیلی نہیں آئی، ابن ماجد رہی ہے جس نے واسکو دی گاما کی ہندوستان کے ساحلوں تک پہنچنے میں رہنمائی کی۔

عباسی سماج کے گہرے مطالعہ سے یہ پتہ چل جائے گا یہ سماج بنیادی طور سے سوداگر سماج تھا۔ سوداگر طبقہ سماج کا ایک اہم حصہ تھا، باقی طبقوں میں امرا، علما، فوجی، کامی اور دستکار، کسان اور غلام تھے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ طبقے سماج کی مختلف سطحوں کی نمائندگی کرتے تھے جن میں سوداگر طبقہ اس وقت کا کھاتا پیتا متوسط طبقہ تھا۔ اسلام کے بالکل ابتدائی عہد سے تجارت کے پیشہ کو دنیائے اسلام میں ایک باعزت جگہ مل گئی تھی۔ رسولِ اکرمؐ کی مثال، جو خود بھی اپنی جوانی میں ایک تاجر تھے، ذہنوں میں تازہ رہتی تھی، اسلامی دارالحکومت کی دمشق سے کنارِ دجلہ بغداد کی طرف تبدیلی نے خلیج فارس کے راستہ، سمندری تجارت کے لئے

بے نہایت امکانات پیدا کر دئے تھے، خلیج فارس جو اسلام کے عروج سے پہلے ایرانیوں کی جہاز رانی کی سرگرمیوں کا مرکز تھی اب عربوں کے حصے میں آگئی اور ان کی تجارتی اور دوسری سرگرمیوں کی جولاں گاہ بن گئی، اسلام سے قبل عرب محض مشرق اور مغرب کے مابین ہونے والی تجارت کا ذریعہ متوسط تھے لیکن اب انھیں ایرانیوں سے جہازرانی کے فن کو سیکھنے کا موقع مل گیا تھا جسے انھوں نے اپنے تجارتی مقاصد کے لئے استعمال کیا۔

عباسی معاشرہ کی ایک دوسری ممتاز خصوصیت لوگوں میں عقلیت پسندی اور فکری آزادی (لبرلزم) کا رجحان تھا، یہ نتیجہ تھا یونانی علوم کے مطالعہ کا مسلمانوں کی تعلیم اور ان کا حصولِ علم اب روایتی اسلامی علوم تک محدود نہیں رہ گیا تھا۔ اس کے دائرہ میں وسعت آگئی تھی اور یونانی علوم درس و تدریس کا ایک حصہ بن گئے تھے، اور اگرچہ ان علوم کا مطالعہ پڑھے لکھوں کے ایک چھوٹے سے حلقہ تک محدود تھا لیکن عوام کے لئے اس کی عملی اہمیت بہت تھی، ایسے سماج میں جس کی خاص سرگرمیاں صنعت و تجارت تھیں اور جہاں کے تاجروں کو ہندستان اور چین جیسی بیرونی منڈیوں میں اعلیٰ درجہ کے بیرونی مال سے مقابلہ کرنا ہوتا تھا، قدرتاً سائنسی اور فنی (ٹیکنیکل) معلومات کی اہمیت تجارتی نقطۂ نظر سے اور بھی بڑھ گئی تھی، اس کی مدد سے وہ اپنے مال کی قسم (کوالٹی) کو بہتر کر سکتے تھے۔ اس لئے یونانی علم کا یہ عملی اور تجرباتی حصہ عباسی سماج کے معاشی پہلو سے گہرا تعلق رکھتا تھا اور اس پر براہِ راست اثر انداز تھا، اور انجام کار لوگوں کی خوشحالی کا دارومدار اسی پر تھا۔

اس کے شواہد موجود ہیں کہ عباسی سماج میں ایک ترقی پذیر معاشرہ کی ساری بنیادی ضروریات اور پوشیدہ امکانات موجود تھے، بنیادی طور سے عباسی معاشرہ جاگیردار معاشرہ نہ تھا؟ حالانکہ ایسا بھی ہوتا تھا کہ جب کبھی مرکزی حکومت مالی بحران سے دوچار ہوتی تھی اور خلیفہ کا خزانہ خسارے میں ہوتا تھا تو زمینوں کی کاشت کی ذمہ داری صوبوں کے فوجی گورنروں کو مل جاتی تھی۔ مجموعی طور سے یہ اچھا خاصا شہری معاشرہ تھا، اور سلطنت کی دولت و ثروت کا بڑا حصہ بڑے بڑے شہروں اور آبادیوں میں سمٹ آیا تھا جہاں مختلف اقسام کے سامان اور نفع بخش تجارتی مال کی اختصاصی منڈیاں تھیں، یہاں تک کہ اپنی ابتدائی شکل میں اس عہد میں بینکوں کا نظام بھی قائم تھا۔

پھر (سب سے بڑھ کے) اسلام کا بخشا ہوا سماجی اور بین الاقوامی امتیازِ نظر تھا جو ولولہ اور حوصلہ (انسپریشن)

مکمل ضابطہ تھا اور زندگی کے لئے رہنمائی بھی۔ یہ ایک قسم کی معاشی برابری، سماجی مساوات اور انصاف سکھاتا تھا۔ قوم پرستی یا جمہوریت اپنے جدید معنوں میں موجود ہونے کا اس وقت کوئی سوال نہ تھا؛ کیونکہ بنیادی طور سے قدیم عرب بدوی روایات اور تصورات تھے جو عہدِ جاہلیت سے اسلامی عہد کو ورثہ میں ملے تھے، اسلامی معاشرہ کے اندر یقیناً اخوت اور بھائی چارہ کا احساس پایا جاتا تھا۔ لیکن اسلامی معاشرہ سے باہر نہیں، اور ایک مسلمان سیاح دارالاسلام کی سرحدوں میں جہاں کہیں گھومتا پھرتا نکل جاتا تھا کوئی اجنبیت محسوس نہیں کرتا تھا۔ عباسی سلطنت کے حدود سے باہر، ان جگہوں کے مسلمان بھی اس کا گرمجوشی سے استقبال کرتے جنھیں سیاسی اصطلاح میں دارالحرب کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اس طور پر یہ ایک طرح کی وہی قبائلی عرب اخوت و برادری تھی جسے "عصبیت" کہتے تھے؛ اور اب یہ خونی رشتوں کا شدید لگاؤ مذہبی برادری کے وسیع تر جذبہ میں ڈھل گیا تھا۔ اس جذبہ کی نئی شکل پذیری کا سب سے بڑا ترقی پسند پہلو یہ تھا کہ عام طور سے عرب اور دوسرے لوگ جو اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے انھوں نے اپنے نسلی، قبائلی اور منطقاتی تعصبات یک قلم فراموش کردئے!

عباسی معاشرہ مجموعی حیثیت سے اعلیٰ تہذیب یافتہ اور آفاقی قسم کا معاشرہ تھا۔ بعض پہلوؤں میں یورپ کے نشاۃ ثانیہ کے عہد سے اس کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ مگر یورپ میں یہ عہد سماجی، سیاسی اور مذہبی انقلابات کے ایک سلسلہ سے ہوکر گزرا، اور بالآخر اپنی تمام رعنائی اور توانائی کے ساتھ جدید مغربی تہذیب کی شکل میں ابھرا۔ اس لئے بجا طور پر کوئی یہ پوچھ سکتا ہے کہ دونوں معاشرے اپنی روح اور کردار کے اعتبار سے ایک جیسے تھے تو۔ پھر ایسا کیوں ہے کہ ایک تو تسلسل ٹوٹے بغیر برابر ترقی کرتا چلا گیا، اور دوسرے میں تقریباً گیارھویں صدی ہی سے زوال پذیری کے آثار و علامات دکھائی پڑنے لگی جو بالآخر تنزل اور مسلسل جمود کی شکل اختیار کرگئے؛ اور عہدِ جدید تک یہی کیفیت قائم رہی؟

اس سوال کا اطمینان بخش جواب دینے کے لئے، ہمیں نہ صرف عباسی حکومت کے زوال کے اسباب کا محتاط تجزیہ کرنا ہوگا بلکہ ان مختلف عوامل و حالات کا پتا چلانا ہوگا جو اخلاقی، ذہنی اور دوسرے اعتبارات سے اسلامی معاشرے کے زوال کا سبب بنے۔ میں اُن سیاسی یا معاشی اسباب کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا جو عباسی خلافت کے زوال اور بالآخر اس کے سیاسی اور روحانی اثر کے خاتمہ کا باعث ہوئے؛ یہ امور تو تاریخ عرب کے

جیسا ماہرین نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ مفصل بحث کر کے واضح کر دئیے ہیں۔

میں اس مقالہ میں ایک بنیادی سوال اٹھانا چاہتا ہوں، اور وہ ہے اسلام میں راسخ العقیدگی اور عقلیت پسندی میں تعلق یا زیادہ واضح طور پر یوں کہیئے کہ عباسی عہد میں اور اس کے بعد یونانی علوم اور راسخ العقیدگی کے مابین کشمکش۔ ان دونوں کے مابین رشتہ کی اطمینان بخش صراحت سے، مجھے یقین ہے، اسلامی معاشرہ کے زوال کے اسباب کے بارے میں ایک اہم نکتہ مل جائے گا۔

یوں تو عباسی حکومت تیرھویں صدی کے اواسط میں ختم ہوئی، لیکن مسلمانوں میں اور معاشرہ کے دوسرے حصوں میں ذہنی اور تہذیبی زوال اس سے بہت پہلے دسویں اور گیارھویں صدی ہی میں شروع ہو چکا تھا اور اس کے کچھ ابتدائی اسباب ہیں، یونانی علوم اور خاص کر فلسفہ اور منطق کا مطالعہ بہت پہلے متروک ہو چکا تھا۔ اور راسخ العقیدہ علماء کی رائے ان کے مطالعہ کی ہمت افزائی کے حق میں نہ تھی کیونکہ ان کے نزدیک اس سے اسلام کے بنیادی عقائد پر ضرب پڑتی تھی، یونانیوں کا مادی فلسفہ، اور خاص کر ان کے اس قسم کے نظریات جیسے "کائنات قدیم ہے" غیر اسلامی اور ڈگر سے ہٹے ہوئے تھے، اس قسم کے نظریوں سے مسلمانوں کے اس عقیدہ میں کمزوری آتی تھی جس کے مطابق کائنات وقت اور زمانہ کے اندر وجود میں آئی۔ ایسے 'غیر اسلامی' تصورات و تعلیمات سے گھر جانے اور مغلوب ہو جانے کے خوف سے راسخ العقیدہ علماء اور فقہا نے اس کشمکش کے دور اولین میں دفاعی انداز اختیار کر لیا۔ لیکن اس بار معتزلہ کا فرقہ جو نسبۃً زیادہ روادار اور کھلے ذہن والا فرقہ تھا اسلام کے سیاسی نقشہ پر ابھر چکا تھا۔ سو معتزلہ ہی راسخ العقیدہ علماء کا ہدف اولیں بنے۔ اسلام اور کفر کے مابین درمیانی راہ" "المنزلۃ بین المنزلتین" کے مسلک پر انھیں ملامت کی گئی۔ یہ محض اتفاقی امر نہ تھا کہ اسلام میں یونانی علوم کے سب سے بڑے سرپرستوں میں سے ایک خلیفہ مامون الرشید (المامون) معتزلی نظریات کا حامل تھا اور اعلیٰ سرکاری عہدوں پر بھی صرف ان لوگوں کو مقرر کرتا تھا جن کے خیالات اس قسم کے ہوتے تھے۔

راسخ العقیدگی جلد ہی اس کشمکش میں غالب آ گئی تھی اور اپنی پوزیشن کو حدیث نبوی کی پشت پناہی میں استوار کر لیا تھا۔ حدیث کے مجموعے بہت پہلے سے مرتب ہونے لگے تھے اور اپنے اندر ایک ہی اپیل

بلکہ دیتا تھا اور زندگی کے لئے رہنمائی بھی۔ یہ ایک قسم کی معاشی برابری، سماجی مساوات اور انصاف کا تصور تھا۔ قوم پرستی یا جمہوریت اپنے جدید معنوں میں موجود ہونے کا اس وقت کوئی سوال نہ تھا؛ کیونکہ بنیادی طور پر عرب بدوی روایات اور تصورات تھے جو عہد جاہلیت سے اسلامی عہد کو ورثہ میں ملے تھے، اسلام کے اندر یقیناً اخوت اور بھائی چارہ کا احساس پایا جاتا تھا۔ لیکن اسلامی معاشرے سے باہر نہیں، اور ایک مسلم سیاح دارالاسلام کی سرحدوں میں جہاں کہیں گھومتا پھرتا نکل جاتا تھا کوئی اجنبیت محسوس نہیں کرتا تھا۔ سلطنت کے حدود سے باہر، ان جگہوں کے مسلمان بھی اس کا گرمجوشی سے استقبال کرتے جنھیں سیاسی اعتبار سے دارالحرب کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اس طور پر یہ ایک طرح کی وہی قبائلی عرب اخوت و برادری تھی جسے "عصبیت" کہتے تھے؛ اور اب یہ خونی رشتوں کا شدید لگاؤ مذہبی برادری کے وسیع تر جذبہ میں ڈھل گیا تھا۔ اس عہد کی نئی شکل پذیری کا سب سے بڑا ترقی پسند پہلو یہ تھا کہ عام طور سے عرب اور دوسرے لوگ جو اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے انھوں نے اپنے نسلی، قبائلی اور منطقاتی تعصبات یک قلم فراموش کردئے!

عباسی معاشرہ مجموعی حیثیت سے اعلیٰ تہذیب یافتہ اور آفاقی قسم کا معاشرہ تھا۔ بعض پہلوؤں سے یورپ کے نشاۃ ثانیہ کے عہد سے اس کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ مگر یورپ میں یہ عہد سماجی، سیاسی اور انقلابات کے ایک سلسلہ سے ہوکر گزرا، اور بالآخر اپنی تمام رعنائی اور توانائی کے ساتھ جدید مغربی تہذیب کی شکل میں ابھرا۔ اس لئے بجا طور پر کوئی یہ پوچھ سکتا ہے کہ دونوں معاشرے اپنی روح اور کردار کے اعتبار سے جیسے تھے تو — پھر ایسا کیوں ہے کہ ایک تو تسلسل ٹوٹے بغیر برابر ترقی کرتا چلا گیا، اور دوسرے میں تقریباً گیارھویں صدی ہی سے زوال پذیری کے آثار و علامات دکھائی پڑنے لگی جو بالآخر تنزل اور مسلسل جمود کی شکل اختیار کر گئے؛ اور عہد جدید تک یہی کیفیت قائم رہی؟

اس سوال کا اطمینان بخش جواب دینے کے لئے، ہمیں نہ صرف عباسی حکومت کے زوال کے اسباب کا محتاط تجزیہ کرنا ہوگا بلکہ ان مختلف عوامل و حالات کا پتا چلانا ہوگا جو اخلاقی، ذہنی اور دوسرے اعتبارات سے اسلامی معاشرے کے زوال کا سبب بنے۔ میں اُن سیاسی یا معاشی اسباب کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا جو خلافت کے زوال اور بالآخر اس کے سیاسی اور روحانی اثر کے خاتمہ کا باعث ہوئے؛ یہ امور تو تاریخ

جیسا ہرین نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ فلاصلاً بحث کرکے واضح کر دیے ہیں۔

میں اس مقالہ میں ایک بنیادی سوال اٹھانا چاہتا ہوں، اور وہ ہے اسلام میں راسخ العقیدگی اور عقلیت پسندی میں تعلق یا زیادہ واضح طور پر یوں کہیے کہ "عباسی عہد میں اور اس کے بعد یونانی علوم اور راسخ العقیدگی کے مابین کشمکش"۔ ان دونوں کے مابین رشتہ کی اطمینان بخش صراحت سے، مجھے یقین ہے، اسلامی معاشرہ کے زوال کے اسباب کے بارے میں ایک اہم نکتہ مل جائے گا۔

یوں تو عباسی حکومت تیرھویں صدی کے اواسط میں ختم ہوئی، لیکن مسلمانوں میں اور معاشرہ کے دوسرے حصّوں میں ذہنی اور تہذیبی زوال اس سے بہت پہلے دسویں اور گیارھویں صدی ہی میں شروع ہو چکا تھا اور اس کے کچھ ابتدائی اسباب ہیں، یونانی علوم اور خاص کر فلسفہ اور منطق کا مطالعہ بہت پہلے متروک ہو چکا تھا۔ اور راسخ العقیدہ علماء کی رائے ان کے مطالعہ کی ہمت افزائی کے حق میں نہ تھی کیونکہ ان کے نزدیک اس سے اسلام کے بنیادی عقائد پر ضرب پڑتی تھی، یونانیوں کا مادی فلسفہ، اور خاص کر ان کے اس قسم کے نظریات جیسے "کائنات قدیم ہے" غیر اسلامی اور ڈگر سے ہٹے ہوئے تھے، اس قسم کے نظریوں سے مسلمانوں کے اس عقیدہ میں کمزوری آتی تھی جس کے مطابق کائنات وقت اور زمانہ کے اندر وجود میں آئی۔ اسی لیے 'غیر اسلامی' تصورات و تعلیمات سے گھر جانے اور مغلوب ہو جانے کے خوف سے راسخ العقیدہ علما اور فقہا نے اس کشمکش کے دور اولین میں دفاعی انداز اختیار کر لیا۔ لیکن اس بار معتزلہ کا فرقہ جو نسبتاً زیادہ روادار اور کھلے ذہن والا فرقہ تھا اسلام کے سیاسی نقشہ پر ابھر چکا تھا۔ سو معتزلہ ہی راسخ العقیدہ علماء کا ہدف اولیں بنے۔ اسلام اور کفر کے مابین درمیانی راہ "المنزلۃ بین المنزلتین" کے مسلک پر انھیں ملامت کی گئی۔ یہ محض اتفاقی امر نہ تھا کہ اسلام میں یونانی علوم کے سب سے بڑے سرپرستوں میں سے ایک خلیفہ ہارون الرشید (المامون) معتزلی نظریات کا حامل تھا اور اعلیٰ سرکاری عہدوں پر بھی صرف ان لوگوں کو مقرر کرتا تھا جن کے خیالات اس قسم کے ہوتے تھے۔

راسخ العقیدگی جلد ہی اس کشمکش میں غالب آ گئی تھی اور اپنی پوزیشن کو حدیث نبوی کی پشت پناہی میں استوار کر لیا تھا۔ حدیث کے مجموعے بہت پہلے سے مرتب ہونے لگے تھے اور اپنے اندر ایک اہم پہلو

رکھتے تھے، دوسری طرف لبرلزم یا آزاد خیالی، ذہنی تحریکوں کی ایک تھی رد بنی ہوئی تھی۔ جو ا
ابھر کے کبھی کبھی ہی آتی تھی، یا ایسے مواقع پر نمودار ہوتی تھی۔ جب سیاسی مصالح اس کے لئے رضامند
تھے۔ یونانی علوم اور فلسفہ کی تعلیم و تدریس جاری رہی اگرچہ اس کے لئے فضا گھٹی گھٹی اور کبھی کبھی
رہنے لگی تھی۔ یہ امام ابوالحسن اشعری تھے۔ جنھوں نے معتزلہ سے ان کے اپنے میدانوں میں ٹکر لی
بایت کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اسلام میں راسخ العقیدگی کے کامل غلبہ کے عہد کا آغاز کیا۔ عمل ا
کے اس سلسلہ کا نقطۂ عروج امام غزالی کی صورت میں نمودار ہوا جن کی فراست نے ایک طرف تو
اور تصوف میں تال میل پیدا کیا اور دوسری طرف علوم اسلامیہ کو یونانی علوم کے مقابلہ پر برتری
امام غزالی اسلام میں متعدد متخالف اور متضاد قوتوں کے درمیان ایک ہم آہنگی پیدا کرنے میں
ہو گئے، لیکن یہ بھی ہوا کہ ایک بڑی نازک ذہانت کو کام میں لا کے وہ ایسا بھی کر گئے کہ اسلام کے
کسی بھی گوشہ میں کسی انقلاب، ترقی، تبدیلی، یا سوال اٹھانے کی ساری امیدیں اور امکانات ختم
اس طرح اسلام میں پہلی بار تقلید سکہ بند مذہبیت کی بنیادیں استوار ہو گئیں۔ شریعت محض کچھ بند
اصولوں کا مجموعہ ہو کے رہ گئی اور مسلمان کی زندگی کے سارے پہلو اس پر پرکھے جانے لگے، وہ
پڑھتے تھے اور اپنے کو فلسفی کہتے تھے، ان پر امام غزالی کے کامیاب وار نے ہمیشہ کے لئے اس ا
صادر کر دیا کہ یونانی فلسفہ اور بالواسطہ وہ سارا علم جو یونانی الاصل ہو، اس کا مطالعہ مناسب۔
اور اس کا جواب قطعیت کے ساتھ نفی میں تھا۔ بعد میں اس بات کی بھی ایک کوشش ہوئی کہ
راسخ العقیدہ مکاتب فکر کی طرف جھکاؤ دے کر ڈھالا جائے، مدرسوں کا سلسلہ اسلامی دنیا کے
شہروں میں پھیلا دیا گیا جہاں علوم اسلامیہ کے ساتھ کچھ 'سنسر شدہ' یونانی علوم بھی پڑھائے،
اس سب کا مرکزی نتیجہ یہ تھا کہ مسلمان بچوں کو نکی بندھی جامد تعلیم ایک کے بعد دوسری نس
تازہ علم کے لئے تو کوئی میدان تھا ہی نہیں، اور تلاش و جستجو کی اسپرٹ بھی کم ہو گئی تھی، درسی کتا
نظر ثانی ہوتی تھی، نہ پرانی کتابوں کی جگہ کوئی نئی کتاب لیتی تھی، بہت عرصہ پہلے مصنفوں نے
تیار کر دی تھیں وہ ایک راسخ العقیدہ انداز سے بلا نقد و تبصرہ اور بلا سمجھے بوجھے پڑھائی

عہدِ زوال میں علومِ طبیعی (نیچرل سائنس) اور خالص سائنس کا بھی یہی حشر ہوا یعنی جغرافیائی قبیل کے کچھ علوم کو چھوڑ کر جن کا اندرونی اور بیرونی تجارت پر براہِ راست اثر پڑتا تھا، باقی سب پر جمود آگیا۔ طب کو اچھا خاصا دھکا پہنچا، اور یہ غالباً اس وجہ سے کہ جراحی (سرجری) اور دوسری شاخوں میں ریسرچ اور تجربوں کی ہمت افزائی اور حمایت میں کمی آگئی، ابن سینا اور رازی کے زمانے کے بعد مسلمان طبیبوں کا کوئی خاص کارنامہ نظر نہیں آتا۔ بس شاید جسمِ انسانی میں خون کی گردش کے بارے میں نفیس کے نظریات ایک استثنا ہیں، دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ ایلوپیتھی نے، جس کی شروعات اور بنیاد طبِ یونانی کی طرح بقراط اور جالینوس کی تعلیمات تھیں، یورپ میں خوب ترقی کی؛ اور عہدِ جدید میں تو اس کی ترقیوں کی کوئی حد ہی نہیں رہی ہے۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ طب کے معاملہ میں بہت پہلے نظریہ اور عمل ایک دوسرے کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ اور چونکہ تجرباتی پہلو ترک کر دیا گیا تھا، اس لئے ابن سینا جیسے قدیم ماہروں کی لکھی ہوئی نظریاتی کتابیں صدیوں تک مطالعہ کا منتہا بنی رہیں۔

جہاں تک کیمسٹری کا تعلق ہے۔ یہ مختلف صنعتوں میں استعمال کی جاتی رہی، اور اس طرح ایک تجرباتی رُخ اختیار کرتی رہی۔ لیکن شروع کے سائنس دانوں کی آرزوئے نایافت کہ دھات کو سونے میں تبدیل کر سکیں اتنی شدید اور غالب تھی کہ کیمسٹری کو باقاعدہ سائنس کے طور سے مطالعہ میں آنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ علومِ ریاضی و ہیئت نے مسلمانوں میں اچھی خاصی ترقی کی، لیکن سکۂ بند مذہبیت کے مردہ دلانہ رویہ کو امام غزالی سے بھی بہت پہلے البیرونی جیسی عظیم شخصیت نے محسوس کر لیا تھا، وہ شاکی تھا کہ کچھ لوگ مسلم سائنسوں کے مطالعہ پر نکتہ چیں تھے، اور ان کے خلاف ایک جذبۂ عناد رکھتے تھے۔ البیرونی کا کہنا ہے کہ یہ مخالفت کچھ علمی وجوہ کی بنیاد پر نہ تھی؛ بات یہ تھی کہ ان لوگوں کے کچھ پس پردہ مقاصد بھی تھے۔ اور اس طریقہ سے وہ ان لوگوں کو نقصان پہنچانا چاہتے تھے جو ان علوم کا مطالعہ کرتے تھے۔

گیارھویں صدی تک سائنسوں کے مطالعہ میں ایک عام زوال کی تکمیل ہو چکی تھی، جو سائنسی کتابیں لکھی جاتی تھیں، ان کی نوعیت چبائے ہوئے نوالوں کی سی تھی۔ اور زیادہ تر یہ قدیم کتابوں کے محض حواشی، شرح، یا خلاصے ہوا کرتے، اس عہد کے بعد کوئی چھ صدیوں تک دمشق، بغداد، قاہرہ، سمرقند،

اصفہان، بغداد، دہلی اور آگرہ کے مدرسوں میں علم اور متعلم دینیات کے ساتھ ان چند منتخب کا مطالعہ کرتے رہے جن کے مشتملات اوراق پارینہ تھے اور زنگ آلود! ایسے میں جو کوئی بنیاد چھیڑنے کی کوشش کرتا، یا توجیہ نو کی بابت سوچتا اُسے مدرسیت (اشاعرہ متکلمین) کے حملوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ بدعت اور الحاد کے الزامات اس پر مستزاد تھے، مجموعی حیثیت سے بادشاہ یا سلطان کو اگر علوم و فنون میں خود دلچسپی ہوتی تھی تو ترقی کے امکانات پیدا ہو جاتے تھے جیسے مثلاً علم ہیئت، جغرافیا اور طب کا معاملہ ہے جو مشرق میں کچھ مسلمان سلطنتوں میں خوب پنپے، لیکن یہ ترقی بڑی منتشر، بے ربط اور گریز پا تھی۔

تصوف نے بلاشبہ اسلامی تاریخ میں "لبرلزم پھیلانے والا رول ادا کیا"۔ اور نہ صرف شرعی بندشوں کو زیادہ سخت اور زیادہ شدید بننے میں آڑے آیا بلکہ اس کی بدولت اسلام کے دینی ادب میں تازگی بھی آگئی، تصوف کا بالکل ویسا ہی رول تو نہیں جیسا اسلام کے ابتدائی عہد میں معتزلہ کا رہا! "کے اندرون میں یہ ایک اہم تحریک ضرور رہی، اور رہے، جو شریعت اور راسخ العقیدگی کے متوازی چلتی رہی۔" رفتہ رفتہ تصوف نے اپنے قدیم انداز و طریق میں خاصی تبدیلی کرلی، اور وہ ولولہ اور جولانی بھی کھو دی جو شروع عہد میں اس کی خصوصیت تھی کہ محتسب لوگ زیادہ من چلے آزاد خیال صوفیا کو مشکل ہی سے برداشت کرتے تھے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ "اسلام میں ایک منظم راسخ العقیدگی" کے عروج کے نتیجہ میں نہ صرف فلسفہ اور علوم پر زوال آیا، بلکہ پورے اسلامی معاشرے کے زوال کا خاص سبب بن گیا۔ جب معلومات کا اضافہ اور پھیلاؤ بند ہو گیا، اور جب فکری آزادی اور اکاڈمی آزادی کے فقدان کے سبب اس کے افق تنگ تر ہوتے گئے، اور جب تجربات اور مسلمانوں کی ضروریات کے لحاظ سے سائنس کا عملی اطلاق ختم ہوتا چلا گیا ——— تو لوگوں کے مادی حالات پر بھی اثر پڑا، اور نتیجۃً ان میں بھی شکست و انتشار آگیا۔ سائنس کو اب صنعت و تجارت میں مطلق استعمال نہیں کیا جاتا تھا؛ عوام کی معاشی حالت پر اس کا برا اثر مرتب ہونے لگا۔

اس پورے عہد زوال میں ایک اہم بات یہ تھی کہ عہد جدید سے پہلے پوری اسلامی دنیا میں کسی

تحریک کا نشان نہیں ملتا۔ اصلاحی تحریک کے فقدان کے سبب مسلمانوں کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر سکہ بند مذہبیت کی گرفت قائم رہی، مذہب کو زندگی کے دوسرے شعبوں سے الگ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ سو مذہبی طاقت اپنی مختلف شکلوں میں بالادستی قائم کیے رہی۔ پھر یہ بھی ہوا کہ ایک بار جب اسلام پر جمود طاری ہوگیا۔ اور اسلام اپنا ابتدائی انقلابی انداز اور اسپرٹ کھو بیٹھا، تو اس کے بعد کسی کے لئے بھی یہ مزید دشوار ہوگیا کہ سکہ بند علما یا وسطِ ایشیا کے سے متشدد صوفیا کی ناراضگی مول لے سکے یا اس کا مقابلہ کرسکے۔ یہ ایک اہم بات تھی، اور اس کی اہمیت اب تک قائم ہے، سترھویں اور اٹھارھویں صدی سے البتہ یہ ہوا کہ اسلامی دنیا میں مغربی سائنس اور کلچر کے زیرِ اثر تبدیلیاں آرہی ہیں؛ افکار و تصورات کے نئے انداز پرانوں کی جگہ لے رہے ہیں؛ اور معاشرہ من حیث المجموع حیاتِ نو سے آشنا ہو رہا ہے۔ صنعتی ترقیوں کے زیرِ اثر، جو اکثر مشرقی ممالک میں ہورہی ہیں، تبدیلیاں آنی لازمی ہیں؛ اور انجام کار زندگی کا سارا اندازِ نظر بدل جاتا ہے۔ تاہم آج بھی سکہ بند مذہبیت، جہاں کہیں اور جب کبھی اسے موقع مل جاتا ہے ابھر آتی ہے؛ اور ترقی کی تیز رفتار کے راستے میں ایک دیوار بن جاتی ہے۔ اس لئے وقت کا فوری تقاضا کہ اسلام میں ایک اصلاحی تحریک اُٹھے اور دین و شریعت کی نئی توجیہ کی جائے۔

(۲)

ڈاکٹر مقبول کے اس مقالہ میں جو دو تین سال پہلے انڈین شہری کانگریس میں پڑھا گیا تھا اور شاید اب تک اصل انگریزی میں بھی نہیں چھپا ہے۔ اسلامی معاشرہ کے تنزل کے متعدد اسباب میں سے ایک سبب کو جس تجزیاتی رنگ اور ٹھہر ٹھہر کر سوچے جانے کے انداز میں پیش کیا گیا ہے اُس سے لکھنے والے کے خلوصِ فکر اور نیک نیتی کا اندازہ ہوجاتا ہے؛ اور نتائج یا رایوں کے اختلاف کے باوجود، امید ہے، اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ جو پڑھنے والے اس سے متفق ہوں گے ان کے لئے یہ مختصر سا مقالہ ایک بڑے تھیسس کے خاکہ کا درجہ رکھتا ہے اور جو لوگ اس سے اختلاف کریں گے ان کے لئے یہ ایک عمدہ دعوتِ فکر ہے؛ ایسی جو علمائے ہند کے سامنے اب تک پیش نہیں کی گئی، برہان کے صفحات پر اس کی اشاعت اسی لئے ضروری سمجھی گئی کہ ہم اپنے ذہین طبقہ کے ایک ایسے اندازِ فکر سے بھی آشنا ہوتے رہیں جس کا مرکزی خیال شاید ہمارا جیسا نہیں، یہ طبقہ مشرقی